© rasailojaraid.com

جائزہ انسانی حقوق ۱۹۹۸ء

(مذہبی اقلیتوں کی صورتِ حال پر سالانہ رپورٹ)

مرتب و ناشر : قومی کمیشن برائے امن و انصاف - لاہور

اشاعت : ۲۰ اپریل ۱۹۹۹ء

صفحات : ۹۶

قیمت : پچاس روپے

زیرِ نظر رپورٹ ''قومی کمیشن برائے امن و انصاف'' کی جانب سے مرتب اور شائع کی گئی ہے جو ''کاتھولک بشپز کانفرنس آف پاکستان'' کی نگرانی میں ۱۹۸۴ء سے کام کر رہا ہے۔ قومی کمیشن کے حسبِ ذیل اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں:

- انسانی حقوق کے تحفظ و ترویج میں مخلوقِ خدا کو اُن کے ہمہ وقت کردار کے لیے تیار کرنا تاکہ ایک امن پسند اور منصفانہ معاشرہ تشکیل پا سکے۔
- انسانی حقوق اور امن و انصاف کے متعلق سوالات کا بائبل مقدس اور چرچ کی تعلیمات کی روشنی میں مطالعہ کرنا۔
- مطالعہ کی نشر و اشاعت کرنا اور امن و انصاف کے متعلق شعور اور آگاہی کو توسیع دینا۔
- انسانی حقوق کے معاملات پر مناسب ردِ عمل کا اظہار کرنا۔
- انصاف، امن اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے دنیا بھر میں دیگر ہم خیال تنظیموں سے رابطہ اور تعاون کرنا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رپورٹ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اقلیتوں میں ''قومی کمیشن برائے امن و انصاف'' کی اصل توجہ مسیحی اقلیت پر مرکوز رہی ہے، باقی اقلیتوں میں سے ہندوؤں اور احمدیوں کا ذکر ضمناً آیا ہے، حالانکہ ہندو وطنِ عزیز کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔

وطنِ عزیز کی مسیحی برادری کے حوالے سے یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ مسیحی برادری میں بڑا حصہ پنجابی مسیحیوں کا ہے جن کے آباء و اجداد کا تعلق ہندوؤں کی نچلی ذاتوں یا ذات باہر لوگوں سے تھا۔ ان لوگوں نے اپنے سماجی مرتبے اور اقتصادی بدحالی کے باعث اپنے آبائی مذہب و معاشرہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسیحیت اختیار کی تھی۔ یہ لوگ ہندومت سے حکمرانوں کے مذہب مسیحیت میں تو آ گئے، مگر چرچ کے مادی وسائل اور حکمرانوں سے اِس کے ربط ضبط کے باوجود نومسیحی یا اُن کی اولاد تعلیم اور اقتصادی حیثیت کے اعتبار سے کوئی خاص پیش رفت نہ کر سکی۔ چرچ نے برصغیر میں تعلیم کے فروغ میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے، چرچ رہنما بڑے فخر سے بعض سرکردہ مسلمان اور ہندو رہنماؤں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے مسیحی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی، مگر خود چرچ کے پیروکاروں کی دُنیا میں علم کی روشنی نہ آ سکی، اور آج پاکستان اور بالخصوص پنجاب میں مسیحی برادری کی غالب اکثریت دیہات میں بے زمین کسانوں کی حیثیت سے زمینداروں کی خدمت انجام دے رہی ہے، یا شہروں میں صفائی کے پیشے سے وابستہ ہے۔

وطنِ عزیز نے نوآبادیاتی دور کا جوزمیندارانہ معاشرہ ورثے میں حاصل کیا ہے، اِس میں نسل پرستی اور ذات پات کے اثرات خاصے مضبوط ہیں۔ مسلمان جنھیں ''ان المومنون اخوۃ'' کی تعلیم دی گئی ہے، ان میں بھی برتر اور کم تر کا تصور خاصا راسخ ہے۔ دیہی معاشرے میں نسب اور اقتصادی حیثیت سے لوگوں کا معاشرتی مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو نہ تو نسبی لحاظ سے اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور نہ ان کی اقتصادی حیثیت ہی مستحکم ہے، ''کمین'' سمجھے جاتے ہیں، اور اسی طرح اُن سے برتاؤ ہوتا ہے۔ مسیحی برادری معاشرتی اعتبار سے سب سے نچلے درجے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تعلق رکھتی ہے، اِس لیے ''طاقت'' اور ''جبر'' کے معاشرے میں اِس کا مسائل سے دو چار ہونا تعجب انگیز نہیں، مگر یہ مسائل اُن مسلمانوں کے بھی ہیں جو اُن کی طرح ''بے زمین'' اور ''کمی کمین'' ہیں۔ وطنِ عزیز کے دیہی زمیندارانہ معاشرے میں طاقتور اور با اثر افراد کے ہاتھوں غریب اور نادار لوگ آئے دن مشکلات سے دو چار ہوتے رہتے ہیں، اور اُنہیں حصولِ انصاف میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اِس صورتِ حال کی تبدیلی کے لیے جو بھی، اور جس بھی طبقے کی جانب سے اقدام کیا جائے، خوش آئند ہے۔ ''قومی کمیشن برائے امن و انصاف''، اگر امن و انصاف کے متعلق شعور عام کرنے کی کوشش کرتا ہے تو قابلِ تحسین ہے، مگر اِس کی جاری کردہ زیرِ نظر رپورٹ سے اولاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''کمیشن'' کو پاکستان کی نظریاتی حیثیت سے اتفاق نہیں، وہ اِسے ''اسلامی جمہوریہ'' دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ رپورٹ کے مرتبین کو آئین پاکستان کی اُن تمام دفعات پر اعتراض ہے جو وطنِ عزیز کی اسلامی شناخت اور معاشرے کو نو آبادیاتی اثرات سے نکال کر اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔ رپورٹ کے مرتبین کے نزدیک یہ دفعات ''مذہبی اقلیتوں سے امتیازی سلوک'' کا باعث ہیں (ص ۴۲)۔ اقلیتوں کے ساتھ ''امتیازی سلوک'' کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں، ان میں یہ شامل ہیں:

۱۔ ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ آرٹیکل ۲، آئین پاکستان

۲۔ ریاست کے سربراہ کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ آرٹیکل ۲ - ۴۱، آئین پاکستان

۳۔ وزیر اعظم کا حلف شیڈول (آرٹیکل ۳-۹۱) ظاہر کرتا ہے کہ یہ عہدہ بھی مسلمان کے لیے مختص ہے۔ حلف برداری میں اُسے قرآن و سنت اور نبی اکرمؐ کے آخری نبی ہونے پر عقیدہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔

۴۔ ملک میں اسلامی احکامات کے منافی کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ آرٹیکل ۲۲۷،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئین پاکستان

۵۔ ۱۹۹۱ء میں ایک شریعت بل قومی اسمبلی میں منظور کیا گیا جس نے شریعت کو پاکستان کا ''قانونِ اعلیٰ'' قرار دیا۔

۶۔ گزشتہ ۴۲ برسوں سے پاکستان میں ایک اسلامی نظریاتی کونسل کام کر رہی ہے جس کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ اسلام کے منافی قانون سازی کی نشاندہی کرے۔ آرٹیکل ۲۲۸، آئین پاکستان

۷۔ فیڈرل شریعت کورٹ متوازی عدلیہ کے طور پر کام کر رہی ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل جیسے اضافی اختیارات کی حامل ہے۔ آرٹیکل ۲۰۳۔اے تا جے

۸۔ آئین پاکستان کی دفعہ ۳۱ کے تحت حکومت پاکستان پہلے ہی معاشرے میں اسلامی طرزِ حیات کے فروغ کے اختیارات رکھتی ہے۔

۹۔ فیڈرل شریعت کورٹ کسی بھی قانون کو اسلامی احکامات کے منافی قرار دیتے ہوئے مسترد کر سکتی ہے اور اس کے کالعدم قرار دینے یا اس میں ترامیم کی تجاویز دے سکتی ہے۔ آرٹیکل ۲۰۳ ڈی، آئین پاکستان۔

رپورٹ کے مرتبین کو اِن دفعات کے ساتھ اُن تمام اقدامات پر بھی شدید اعتراض ہے جو اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کیے گئے ہیں۔ نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر بنک کھاتوں، زکوٰۃ کی کٹوتی، حدود آرڈیننس، قصاص و دیت آرڈیننس، قانونِ شہادت اور قانون تحفظ ناموسِ رسالت پر اعتراض کیا گیا ہے (صفحات ۴۳-۴۴)۔

''قانون تحفظ ناموسِ رسالت'' (دفعہ ۲۹۵-ج) کے پس منظر میں رپورٹ کا باب ''تکفیر کے قانون اور مقدمات'' (صفحات ۴۹-۶۱) لکھا گیا ہے۔ اِس میں جہاں موجودہ مسلم لیگی حکومت کی مجوزہ پندرہویں آئینی ترمیم (جو قومی اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد سینیٹ میں نہ پیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جا سکی) کے بعض حامیوں کے غیر محتاط رویے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں توہینِ رسالت کے جرم کی سزا پر گفتگو کی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں پاکستان میں انسانی حقوق کا جائزہ لیتے لیتے رپورٹ کے مرتبین ایران اور انگلستان تک چلے گئے ہیں، کیونکہ ایرانی حکومت کی جانب سے سلمان رشدی کے خلاف امام روح اللہ خمینی کے فتویٰ کی مبینہ واپسی پر ایران کے تین علماء اور انگلستان میں ایک مذہبی تنظیم ''المہاجرون'' کے رہنما نے توہینِ رسالت کے مرتکب کی سزا قتل بتائی ہے۔

''توہینِ رسالت'' کے واقعات کی چھان بین میں رپورٹ کے مرتبین کچھ زیادہ تحقیق سے کام نہیں لے سکے۔ لکھا گیا ہے کہ ''ریاض احمد گوہر شاہی کو توہینِ رسالت کا مرتکب ٹھہرایا گیا ہے، کیونکہ اُنہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ حضور پاکؐ اُن کے خوابوں میں آتے تھے (ص ۵۰)۔'' خواب میں نبی اکرمؐ کی زیارت کے دعوے پر کسی کو کبھی توہینِ رسالت کا مرتکب نہیں قرار دیا گیا۔ جن لوگوں نے ریاض احمد گوہر شاہی کی غیر محتاط روش پر گرفت کی ہے، اُن کے نزدیک گوہر شاہی صاحب کے دعوے حضور پاکؐ کے خوابوں میں آنے سے کہیں زیادہ ہیں۔ اِس باب میں دی گئی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''قانون تحفظ ناموسِ رسالت'' کے تحت گرفتار شدگان میں مسیحی ملزموں کے ساتھ کچھ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والے بھی شامل ہیں۔ ملزموں کا جرم ثابت ہونے پر اُنہیں سزا دی گئی ہے، اور اگر جُرم ثابت نہیں ہوسکا تو ملزموں کو باعزت بری کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی احکام کے نفاذ کے بارے میں اگر مسیحی دینی رہنماؤں کا رویہ اتنا سخت ہے تو کوئی وجہ تعجب نہیں کہ بعض جذباتی مسیحی اِس سے سخت تر رویہ اپنا لیں، اور اُن کی زبان و بیان احتیاط کی حدود پھلانگ جائے۔

رپورٹ کے مرتبین نے نفاذِ شریعت کے داعیوں کو بحیثیتِ مجموعی نشانۂ تنقید بنایا ہے، اور الزام عائد کرتے ہوئے کسی تحریر کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا دو بار تذکرہ آیا ہے۔ لکھا گیا ہے کہ ''۱۱ جولائی ۱۹۹۸ء سے ۴ اگست ۱۹۹۸ء کے دوران

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تنظیم اسلامی کے سربراہ جناب اسرار احمد نے کئی مرتبہ مسلمانوں کو قادیانیوں کے اجتماعی قتل پر اکسایا (ص ۱۲)؛" اسی بات کو دوبارہ دہراتے ہوئے جماعت اسلامی کو بھی لپیٹ میں لے لیا گیا ہے:

"۱۹۹۸ء میں تنظیم اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد نے فتویٰ دیا کہ اسلام کی رُو سے قادیانیوں کا قتل جائز ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد جو کبھی جماعت اسلامی کے رکن تھے اور جنہیں پاکستان کے آخری مارشل لاء (۸۸-۱۹۷۹ء) کے دوران ٹی-وی پروگرام کے ذریعے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی، حقوقِ نسواں کے بھی شدید مخالف ہیں (ص ۲۱)۔" ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم ایک سے زائد رسائل و جرائد شائع کرتی ہے جن میں ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے ساتھ اُن کے خطباتِ جمعہ اور دوسرے اجتماعات کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے واقعی کوئی ایسی تقریریں کی ہیں جن سے رپورٹ کے مرتبین کا بیان درست ثابت ہوتا ہے تو ان کی نشان دہی ہونا چاہیے تھی۔ ورنہ رپورٹ کا بیان محض "الزام" سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

"خواتین کے خلاف جرائم" (صفحات ۲۹-۳۳) کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ وطنِ عزیز کے معاشرے میں جنم لینے والی زیادتی اور ناانصافی کا محض ایک حصہ ہے۔ یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے، مگر کیا ایسے واقعات ۱۹۹۸ء میں غریب مسلمان خاندانوں کے ساتھ نہیں ہوئے۔ مسیحی برادری کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا چرچا کرکے کہیں بیرونِ وطن یہ تاثر پیدا کرنا تو مقصود نہیں کہ مسلمان خاندان تو ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوتے اور صرف غریب اور کمزور مسیحی خواتین مذہبی بنیادوں پر ظلم کا نشانہ بنتی ہیں۔ اگر مجموعی اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے گفتگو کی جاتی تو کم از کم وطنِ عزیز سے محبت کا اظہار تو ہو جاتا۔

رپورٹ کے مرتبین بظاہر "امن وانصاف" کے منادی ہیں، مگر رپورٹ میں بعض مقامات پر "انصاف" کے تقاضے بُری طرح مجروح ہوئے ہیں، اور سستی صحافت کا رنگ نمایاں ہے۔ "مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آزادی'' (صفحات ۲۱ - ۲۸) کے زیرعنوان لکھے گئے باب میں ایک ذیلی عنوان ''عبادت گاہیں'' ہے۔ اِس میں لکھا گیا ہے: ''پاکستان کے کئی علاقوں میں گرجا گھر تعمیر کرنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے حتیٰ کہ اسلام آباد جیسے شہر میں انتظامیہ نے آٹھ برس غور کے بعد گرجا گھر کی تعمیر کی اجازت دی (ص ۲۷)۔'' اگر یہ بھی بتا دیا جاتا کہ اسلام آباد میں پہلے کتنے گرجا گھر موجود ہیں اور اب کس گرجا گھر کی اجازت دی گئی ہے تو رپورٹ زیادہ واضح ہو جاتی۔

مزید لکھا گیا ہے کہ ''شاد باغ لاہور میں گرجا گھر کی تعمیر کئی سال سے معطل ہے، کیونکہ قریبی مسجد کے امام کو مسجد کے نزدیک گرجا گھر کا وجود منظور نہیں اور انتظامیہ اِس امام اور اس کی مذہبی تنظیم کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتی (ص ۲۸)۔'' واللہ اعلم حقیقت کیا ہے؟ مگر کیا یہ درست نہیں کہ مغربی یورپ کے ممالک میں ہر شہری کونسل کسی نئی عبادت گاہ کی تعمیر سے پہلے متعلقہ علاقے کے لوگوں سے اُن کی رائے دریافت کرتی ہے، اور اگر متعلقہ آبادی کی قابلِ لحاظ تعداد کو نئی عبادت گاہ کی تعمیر پر اِس لیے اعتراض ہو کہ اس سے اُن کی آمدورفت میں خلل پیدا ہوگا، یا اُن کے مذہبی جذبات مجروح ہوں گے تو بالعموم عبادت گاہ تعمیر نہیں ہو سکتی۔ مغربی یورپ کی بعض بستیوں میں مسلمان آبادی کی اکثریت ہے، مگر وہ اِس لیے لاوڈ سپیکر پر اذان نہیں دے سکتے کہ مقامی غیر مسلم آبادی کی معتد بہ تعداد کی نیند میں اِس سے خلل پیدا ہوتا ہے۔

صفحات ۲۷ - ۲۸ پر دو تصاویر دی گئی ہیں۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا گیا ہے: ''بدھسٹ سٹوپا سے اینٹیں لے کر تعمیر کی جانے والی مسجد'' اور دوسری تصویر کی عبارت ہے: ''پتن منارا: مقامی بااثر شخصیات کے قبضے میں قدیم یادگار۔'' ان دونوں تصویروں کا رپورٹ کی تحریروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اِسی طرح صفحہ ۸۲ پر پولیس تشدد سے ہلاک ہونے والوں کا ذکر کرتے ہوئے جو تصویر شائع کی گئی ہے وہ ۱۹۹۷ء کے ایک حادثے کی ہے، جبکہ واقعات ۱۹۹۸ء کے بیان کیے جا رہے ہیں۔

اِس سے قطع نظر کہ رپورٹ کے مرتبین نے وطنِ عزیز کی ''اسلامی شناخت'' کو تسلیم نہیں کیا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اپنے بیانات میں ''انصاف'' کے تقاضے بھی پورے نہیں کیے، تاہم اسلامی ریاست کے کار پرداز اِس بات کے دینی طور پر پابند ہیں کہ اقلیتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا اتنا ہی اہتمام کریں جتنا مسلمان شہریوں کے لیے کیا جاتا ہے، اور اِس حوالے سے مسلم یا غیر مسلم کی تمیز نہ ہونا چاہیے۔ اقلیتوں، اور بالخصوص مسیحی اقلیت کو جو مسائل و مشکلات درپیش ہیں، انہیں اسلامی تعلیمات کی حدود کے اندر رہتے ہوئے حل کیا جائے۔

''جداگانہ انتخاب'' کے تحت اگر قومی اسمبلی کے امیدواروں کے لیے پورا ملک حلقۂ انتخاب ہے، اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے پورا صوبہ حلقۂ انتخاب سمجھا جاتا ہے تو اِس کا کوئی حل ہونا چاہیے۔ اِسی طرح اگر مسیحی اقلیتی رہنما شراب کے پرمٹوں کے حق میں نہیں تو مسیحی افراد کے لیے لائسنس منسوخ ہو جانے چاہییں۔

مگر سوال یہ ہے کہ چرچ کے مذہبی رہنما جب سرے سے مسلمانانِ پاکستان کا یہ حق ہی تسلیم نہیں کرتے کہ اُنھیں اپنے دین کے مطابق معاشرے کی تشکیل کا اختیار حاصل ہے، تو اُن کے ساتھ کیسے نتیجہ خیز بات چیت ہو سکتی ہے؟ اور حد یہ ہے کہ جو منصف مزاج اقلیتی رہنما زمینی حقائق کا ادراک رکھتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں وہ رپورٹ کے مرتبین کے نزدیک انتظامیہ کے ''خریدے ہوئے لوگ'' ہیں (ص ۸۴-۸۵)۔ اِس رویے سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چرچ رہنما مسائل کے حل کے بجائے ''احتجاج'' کو ہوا دینے میں اگر شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر مدد دے رہے ہیں جسے کسی طرح بھی ملکی خدمت قرار نہیں کیا جا سکتا۔

اختر راہی

© rasailojaraid.com